شذرہ حسین

اسسٹنٹ پروفیسر

شعبۂ اردو، سندھ یونی ورسٹی، جام شورو

سرسیّد اور امام بخش صہبائی کے باہمی تعلقات
(''آثار الصنادید'' کے تناظر میں)

ABSTRACT

Association between Sir Syed Ahmed Khan and Imam Bahsh Sehbai: As seen through Asaar-us-Sanadeed.

By Shazra Hussain, Assistant Professor, Department of Urdu, Sindh University, Jamshoro.

The 19th century India was a hub of knowledge, education, wealth and opportunities despite its falling into the hand of The British Empire. Delhi, its capital had become a center of knowledge and wisdom. The personalities that were contributing towards the glory of Delhi included Sir Syed Ahmed Khan and Imam Bakhsh Sehbai. Sir Syed had been associated with the family of Imam Bakhsh Sehbai quite a long time. His effect on Sir Syed's life is noticeable in many ways. In the second edition of his book on history and archealogy *Asaar-us-Sanadeed*, Sir Syed has confessed that how Imam Bakhsh Sehbai helped him in many ways. This article presents how these two personalities had close relations and how these ties helped Sir Syed write and promote literature in those turbulent times.

اُنیسویں صدی کا نصف اوّل ہندوستان اور خاص طور پر دہلی کے لیے سیاسی اعتبار سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اس دور میں ایک طرف مغلوں کا صدیوں پُرانا سیاسی اقتدار رُو بہ زوال تھا اور دوسری طرف حکومت میں انگریزوں کا عمل دخل روز بروز بڑھ رہا تھا۔ ۱۸۵۷ء میں مغلوں کی حکومت ختم ہوگئی اور انگریز دہلی پر باقاعدہ مسلّط ہوگئے۔ اس طرح ہندوستان میں ایک ایسا سیاسی انقلاب رُونما ہوا جس نے یہاں کی زندگی کے ہر پہلو کو متاثر کیا۔ مسلمانوں کی سیاسی حالت تو دگرگوں ہوئی مگر اہم بات یہ تھی کہ وہ اس نئے منظرنامے اور اس کے اثرات کو قبول کرنے میں بھی پس و پیش کا شکار تھے۔ یہ سرسیّد احمد خان کی ہستی تھی جس نے اس وقت مسلمانوں کی صورت حال کا جائزہ لیا اور اس کے بعد بہ تدریج ایک واضح حکمت عملی ان کے لیے وضع کی[۱] نیز انھیں اس صورت حال سے نکالنے کے لیے عملی طور پر بھی سخت جدوجہد کی۔

سرسیّداحمد خان کے تمام نمائندہ اور اہم کارنامے ۱۸۵۷ء کے بعد سامنے آئے لیکن ان کی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ جنگ آزادی سے قبل ہی وہ دہلی کے علمی و ادبی ماحول میں نمایاں حیثیت کے حامل تھے اور اس دور کے صاحبانِ فضل و کمال کے ساتھ ان کے گہرے مراسم تھے۔ ہندوستان میں دہلی ۱۲۰۶ء سے جس تہذیبی اور ادبی روایات کے مرکز کی حیثیت سے اُبھری تھی اس کا اثر بتدریج سارے ہندوستان پر قائم ہوا تھا۔مغلوں کے سیاسی زوال کے باوجود ان روایات کا اثر ورسوخ باقی رہا۔ ہندوستان کے بیشتر علاقوں میں اس دورِانحطاط میں بھی علما، ادبا، شعرا اور مشائخ اپنے اپنے مخصوص میدانوں میں سرگرم عمل تھے۔ دہلی اس وقت علم و ادب کا سب سے بڑا مرکز تھی۔ اس دورِ زوال میں حسنِ اتفاق سے دارالخلافہ دہلی میں چند اہلِ کمال ایسے جمع ہو گئے تھے جن کی صحبتیں اور جلسے عہدِ اکبری و شاہجہانی کی یاد دلاتے تھے۔(۲) دہلی میں صہبائیؔ، مومنؔ، آزردہؔ، نیرؔ، اشرفؔ، حسرتیؔ کے دیوان خانے علم و ادب کے گہوارے تھے۔ یہی نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ دہلی کے ہر عالم اور امیر کا گھر ایک علمی مرکز تھا اور علم کے چرچے گلی کوچوں تک پھیلے تھے(۳) مولانا فضل حق خیرآبادی اور مفتی صدرالدین آزردہ کے یہاں مشاہیر دہلی کی صحبت رہا کرتی تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مفتی صدرالدین آزردہ کے دیوان خانے کے بارے میں لکھتے ہیں کہ مفتی صاحب کا دیوان خانہ دہلی کے تمام افراد کا مجمع و مرکز تھا۔ اگر کوئی نووارد دہلی آتا اور چاہتا کہ سارے فضل و کمال کو بیک وقت و بیک مجلس دیکھ لے تو وہ سیدھا مفتی صاحب کے دیوان خانے کا رُخ کرتا(۴) گو شان و شکوہ کے سارے پچھلے نقوش مٹ چکے تھے لیکن مٹے ہوئے رنگ و روغن میں بھی عہدِ ماضی کے مرقعوں کی بہار دیکھی جاسکتی تھی۔ بقول حکیم عبدالحیٔ:

> دلّی اس وقت آج کی ایسی دلّی نہ تھی۔ بڑے بڑے کہنہ مشق شاعر مولوی امام بخش صہبائی، علامہ عبداللہ خاں علوی، مفتی صدرالدین خان آزردہ، میرزا اسداللہ خاں غالب، نواب ضیاء الدین خاں نیر، شاہ نصیرالدین نصیر، شیخ محمد ابراہیم ذوق، حکیم آغا جان عیش، حافظ عبدالرحمن خان احسان، میر حسین تسکین اور خدا جانے کتنے سخن ورانِ باکمال کا جمگھٹا تھا۔ جب یہ لوگ ایک جگہ جمع ہوئے ہوں گے تو آسمان کو بھی رشک آتا ہوگا۔(۵)

سرسیّداحمد خان اسی شاندار علمی و ادبی ماحول میں پروان چڑھے تھے۔ ان تمام صاحبانِ فضل و کمال کے ساتھ ان کے مراسم تھے۔ ان میں سے امام بخش صہبائی (۱۸۰۵ء۔۱۸۵۷ء) سے ان کا قریبی تعلق تھا۔ ان دونوں کے درمیان سررشتہ محبت و اخلاق ایسا مستحکم تھا کہ بقول سرسیّد ''گویا دو قالب میں ایک جان جاری و ساری ہے۔''(۶) حالی ''حیاتِ جاوید'' میں لکھتے ہیں:

> مولانا صہبائی سے ان کی دوستی اخوت کے درجے کو پہنچی ہوئی تھی۔(۷)

امام بخش صہبائی سے جو طالب علم مکان پر فارسی پڑھنے آتے تھے، ابتدا میں وہ سرسیّد ہی کے مکان پر ان کو تعلیم دیا

کرتے تھے۔[۸] صہبائی نے ''آثارالصنادید'' اور ''آئین اکبری'' کی تقریظ بھی لکھی۔ ''آثارالصنادید'' میں سرسیّد نے امام بخش صہبائی کا ذکر اس طرح کیا ہے:

> کمالاتِ ظاہری اور جلائل باطنی اور حسن خلیق اور حمائد اطوار میں پسندیدہ خالق ومقبول خلائق ہیں خلق نوش آپ کا آئینہ بہار اور اوضاع حمیدہ آپ کے محمود روزگار اس جزو زمان میں ایسی جامعیت کے ساتھ کم کوئی نظر سے گزرا ہے اور طرفہ یہ ہے کہ فنون متعارفہ سخنوری مثل تحقیق لغت و اصطلاحات زبان دری اور تدقیق مقامات کتابی اور تکمیل عروض و قافیہ و اشکال فن معما وغیرہا میں ایسا کمال بہم پہونچایا ہے کہ ہر فن میں یک فنی کہنا چاہیے۔[۹]

امام بخش صہبائی، سرسیّد کے ہمدم دیرینہ تھے۔ وہ سرسیّد کی منفرد تصنیف ''آثارالصنادید'' کے لیے عمارتوں کے احوال جمع کرنے میں ان کے ساتھ شامل تھے۔ سرسیّد نے اس کتاب کو لکھنے کے لیے سخت محنت و جاں فشانی کی تھی جس میں صہبائی ان کے ساتھ تھے۔ حالی ''حیاتِ جاوید'' میں لکھتے ہیں:

> سرسیّد ہمیشہ تعطیلوں میں عماراتِ بیرون شہر کی تحقیقات کے لیے شہر کے باہر جاتے تھے اور جب کئی دن کی تعطیل ہوتی تھی تو رات کو بھی اکثر باہر رہتے تھے۔ ان کے ساتھ اکثر ان کے دوست اور ہمدم مولانا امام بخش صہبائی مرحوم ہوتے تھے۔[۱۰]

سرسیّداحمد خان نے ''آثارالصنادید'' کے لیے بہت سخت محنت ولگن سے مواد حاصل کیا۔ انھوں نے عمارات کے طول وعرض اور اُونچائی کی پیائش کی نیز ہر کتبے کو اس کے اصل خط میں اُتارا۔ مخدوش عمارتوں کے نقشے بھی تیار کرائے۔ چھینکے میں بیٹھ کر قطب مینار کے کتبوں کے چربے اُتارے۔ جب سرسیّد چھینکے میں بیٹھ کر کتبے اُتارتے تھے اس وقت امام بخش صہبائی کی جو کیفیت ہوتی تھی اس کا ذکر کرتے ہوئے سرسیّد کہتے تھے:

> جس وقت میں چھینکے میں بیٹھتا تھا تو مولانا صہبائی فرطِ محبت کے سبب بہت گھبراتے تھے اور خوف کے مارے ان کا رنگ متغیر ہوجاتا تھا۔[۱۱]

بقول حالی، سرسیّد کی آئندہ ترقیات کی گویا یہ پہلی سیڑھی تھی،[۱۲] اس پہلی سیڑھی تک پہنچنے کے سفر میں امام بخش صہبائی ان کے ہمراہ تھے۔

''آثارالصنادید'' کا پہلا ایڈیشن ۱۸۴۷ء میں مطبع سیّدالاخبار سے شائع ہوا۔ یہ ایڈیشن چار ابواب پر مشتمل ہے۔ ہندوستان کے آثارقدیمہ میں دلچسپی کی وجہ سے انگریزوں نے اس کتاب کو بہت پسند کیا۔ ان میں سے چند مخلص دوستوں نے نظرثانی کے مشورے بھی دیے۔[۱۳] ۱۸۵۴ء میں سرسیّداحمد خان نے کافی ترمیم وتنسیخ کی، بہت سے اضافے بھی

کیے اس لیے اس کتاب کی ترتیب بھی تبدیل کی۔ ''آثارالصنادید'' کے پہلے اور دوسرے ایڈیشن میں مواد کے علاوہ عبارت میں بھی فرق پایا جاتا ہے کیونکہ سرسیّد نے دوسرے ایڈیشن میں مواد کے علاوہ عبارت کو بھی ضرورت کے مطابق تبدیل کیا۔ اب تک یہ کہا جاتا ہے کہ ۱۸۴۷ء کے ایڈیشن کی عبارت رنگین اور مسجع و مقفیٰ تھی۔ دوسرے ایڈیشن کی عبارت کو سادہ وسلیس کردیا ہے۔(۱۴) پہلے ایڈیشن کی بیشتر مرصع و مقفیٰ عبارتیں امام بخش صہبائی نے تحریر کی تھیں، ثقیل عربی و فارسی الفاظ وتراکیب کے استعمال نے ان عبارتوں کو بوجھل اور ناقابلِ فہم بنادیا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> سرسیّد نے جب دوسرا ایڈیشن تیار کیا تو اس میں نہ صرف ترتیب بدلی، اضافے کیے، ترمیم وتنسیخ کی اور جہاں جہاں مناسب جانا عبارت کو بھی ضرورت کے مطابق بدل دیا۔ یاد رہے کہ پہلا ایڈیشن بھی سادہ عبارت میں تھا اور دوسرا بھی پہلے ایڈیشن کی عبارت بھی سرسیّد ہی کی لکھی ہوئی ہے۔ مولانا امام بخش صہبائی کا طرز بیان سب سے الگ اور مفرس ومعرب اور مسجع ومقفّیٰ ہوتا ہے۔ یہ صورت ہرگز ۱۸۴۷ء کے ایڈیشن کی عبارت کی نہیں ہے۔(۱۵)

شبلی نعمانی ''آثارالصنادید'' کے پہلے ایڈیشن کی زبان و بیان کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''آثارالصنادید'' میں اکثر جگہ بیدل اور ظہوری کا رنگ نظر آتا ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ سرسیّد کی رات دن کی صحبت مولانا امام بخش صہبائی سے رہتی تھی اور مولانائے موصوف بیدل کے ایسے دل دادہ تھے کہ ان کا کلمہ پڑھتے تھے اور جو کچھ لکھتے تھے اسی طرز میں لکھتے تھے۔ سرسیّد نے مجھ سے خود بیان کیا کہ ''آثارالصنادید'' کے بعض بعض مقامات بالکل مولانا امام بخش صہبائی کے لکھے ہوئے ہیں جو انھوں نے میری طرف سے اور میرے نام سے لکھ دیے تھے۔(۱۶)

الطاف حسین حالی نے اس سلسلے میں ''حیات جاوید'' میں لکھا ہے:

> ''آثارالصنادید'' کا سب سے پہلا ایڈیشن جس کی عبارت میں بہت کچھ سا خفگی اور تکلف پایا جاتا ہے، وہ جیسا کہ سرسیّد خود اقرار کرتے تھے، مولانا صہبائی کا لکھا ہوا ہے۔(۱۷)

شبلی اور حالی سرسیّد احمد خان کے رفقائے کار میں اہمیت کے حامل ہیں اس لیے ان کے مندرجہ بالا بیان کی بنا پر یہ خیال عام طور پر پیدا ہوا کہ ''آثارالصنادید'' کے پہلے ایڈیشن کی مرصع ومقفیٰ عبارتیں سرسیّد کی نہیں بلکہ امام بخش صہبائی کی لکھی ہوئی ہیں، سرسیّد کے صہبائی سے دوستانہ و برادرانہ تعلقات تھے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ جب سرسیّد ''آثارالصنادید'' کے لیے تفصیلات حاصل کرنے آثار قدیمہ دیکھنے جاتے تھے تو صہبائی بھی ان کے ہمراہ ہوتے تھے۔ صہبائی کتبے پڑھنے میں تو

ان کی مدد کرتے ہوں گے لیکن اس کا امکان بہت کم ہے کہ انھوں نے آثار قدیمہ کے سلسلے میں انھیں مشورے دیے ہوں۔(۱۸)

''آثارالصنادید'' کے پہلے ایڈیشن کی مرصع ومقفیٰ عبارتوں کے بارے میں اوپر بیان کردہ شکوک وشبہات کی حقیقت جاننے سے پہلے دونوں اشاعتوں کے اسلوب میں پائے جانے والے عمومی فرق کو سمجھنے کے لیے اشاعت اوّل اور دوم کے باب سوم کا مطالعہ ضروری ہے کیونکہ دونوں ایڈیشن میں بیشتر عنوانات یکساں ہیں پہلے ایڈیشن میں ''شاہ محل معروف بہ دیوانِ خاص'' کا آغاز اس طرح کیا ہے:

> یہ ایک عمارت ہے نامی اور مشہور بے مثل وعدیل کہ روئے زمین پر اپنا نظیر نہیں رکھتی اور ایسی خوش قطع ہے کہ دوسری دیکھنے میں ہنسی آتی۔ خواب گاہ کی جانب شمال کو ایک بہت بڑا چوک ہے۔(۱۹)

دوسرے ایڈیشن میں ابتدائی تعریفی وتوصیفی کلمات کو حذف کردیا گیا ہے اور ''خواب گاہ کی جانب کو ایک بہت بڑا چوک ہے'' سے آغاز کیا گیا ہے۔ اشاعت اوّل میں شاہ محل کے بارے میں لکھی ہوئی درج ذیل عبارتیں اشاعت دوم میں شامل نہیں کی گئیں۔

۱۔ ایسا سنگ مرمر کہ سپیدۂ صبح اس کے سامنے شب دیجور سے بدتر معلوم ہوتا ہے۔(۲۰)

۲۔ ان کے دیکھنے سے قدرت الٰہی یاد آتی ہے۔(۲۱)

سرسیّد نے تعریفی وتوصیفی کلمات کے علاوہ غیرضروری عبارتیں، جن کا اصل موضوع سے خاص تعلق نہیں، کبھی نظرثانی کرکے نکال دیں۔ مثال کے طور پر اشاعت اوّل میں ''تسبیح خانہ'' کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے:

> اسی چبوترہ پر جس پر یہ عمارت عالی بنی ہوئی ہے جانب جنوب کے عقب ہے۔ خواب گاہ معلّٰی کا ایک دالان بنا ہوا ہے اور وہ تسبیح خانہ کرکے مشہور ہے کبھی کبھی جب خلوت کرتی منظوم ہوتی ہے یا دربار امرائے مخصوص کا ہونا ہے۔ حضوروالا یہاں بھی اجلاس فرمایا کرتے ہیں اس دالان کی دیوار پر بیچوں بیچ میں سنگ مرمر کی میزان بنی ہوئی ہے اور وہاں میزان عدل لکھا ہوا ہے اور بہت سا سنہری کام کیا ہوا ہے۔ کیا اچھا آدمی تھا جس نے اس مقام پر میزان عدل بنائی ہے کہ ہر وقت عبادت کے بادشاہ اس کو دیکھے اور یاد کرے کہ قیامت کے دن میزان عدل الٰہی کھڑی ہوگی۔ بادشاہ اور غریب سب برابر ہوں گے اور سب کے اعمال تولے جاویں گے۔ اسی طرح بادشاہ کو بھی لازم ہے کہ انصاف سے کام کرے اور ہر امر کو میزانِ عدالت میں جانچ کر حکم دے۔ اسی تسبیح خانہ میں سے خواب گاہ کا رستہ ہے کہ وہ خاصی ڈیوڑھی کہلاتی ہے۔(۲۲)

اشاعت دوم میں اس اقتباس سے غیر ضروری تفصیلات کو بیان نہیں کیا گیا اور تسبیح خانہ کا ذکر کرتے ہوئے درج ذیل تفصیلات بیان کی گئی ہیں:

> دیوانِ خاص کے جانب جنوب ایک دالان ہے اور وہ تسبیح خانہ کر کے مشہور ہے۔ اس دالان کی دیوار پر بیچوں بیچ میں سنگ مرمر میں ترازوں کی صورت کھدی اور میزان عدل اس پر لکھا دیا ہے۔ اسی تسبیح خانے میں سے خواب گاہ کا رستہ ہے کہ وہ خاصی ڈیوڑھی کہلاتی ہے۔ (۲۳)

پہلی اور دوسری اشاعت میں تسبیح خانے کے ذکر کا موازنہ کیا جائے تو یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ سرسیّد احمد خان نے اشاعت دوم میں نہ صرف تعریفی وتوصیفی کلمات کو شامل نہ کیا بلکہ انھوں نے اپنی تحریر کو زیادہ سائنٹفک بنانے کے لیے پوری توجہ صرف اصل موضوع کو بیان کرنے پر مرکوز رکھی اور غیر وابستہ باتیں یا ایسی تفصیلات جن کے بیان نہ کرنے سے اصل موضوع متاثر نہ ہوانھیں اشاعت دوم میں شامل نہیں کیا۔

اشاعتِ اوّل کے آخری باب میں مسجع ومقفیٰ اور مرصع نثر کا استعمال کیا گیا ہے۔ اس باب کے کچھ حصے اور پیش لفظ کے ابتدائی چند صفحات مرصع نثر میں ہیں باقی تمام کتاب اس نثر میں لکھی گئی ہے جس میں دوسرے ایڈیشن کی سادہ وسلیس اور عام فہم عبارت ہے۔ اشاعت اوّل کے آخری باب میں اس عہد کے ادبی مذاق کے مطابق مولانا محمد فخر الدین، حکیم احسن اللہ خاں، مفتی صدرالدین آزردہ، مولوی رشید الدین، شاہ رفیع الدین، مولانا فضل امام، مولانا فضل حق، مولوی محمد نورالحسن، غالب، نیر درخشاں، زین العابدین عارف، غلام حسن خان بہادر محو، مولوی عبداللہ خاں علوی، صہبائی، مومن، شیفتہ، ممنون اور ذوق کے ترجموں میں تعریفی وتوصیفی الفاظ اور تراکیب کے ذکر میں مرصع ومقفیٰ پُرتکلف زبان کے استعمال کی بنا پر اس اسلوب کو امام بخش صہبائی سے منسوب کرنا درست نہیں کیوں کہ یہ اسلوب اس زمانے کا عام اسلوب تھا اور اس انداز سے متاثر ہونا فطری امر تھا۔ اس سلسلے میں حالی کی درج ذیل رائے کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے:

> معلوم ہوتا ہے کہ گو اس وقت طبع سلیم اقتضا سے خود سرسیّد کی طرزِ تحریر سیدھی سادی تھی مگر سوسائٹی کے اثر سے یقیناً سادی عبارت لکھنے کو وہ خود حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے جس کی وجہ سے انھوں نے اس بات کو گوارا نہ کیا کہ جن عمارتوں کی تحقیقات نہایت جان کاہ کوشش سے انجام کو پہنچائی ہے، ان کا حال اپنی سیدھی سادی عبارت میں جو اُس وقت خود ان کی نظر میں کم وزن معلوم ہوتی تھی، تحریر کر دیں۔ (۲۴)

سرسیّد کی تصانیف کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس دور کے ادبی ماحول کے اثرات سے دامن نہ بچا سکے۔ شعوری یا لاشعوری طور پر انھوں نے ان اثرات کو قبول کیا، ان کا مذاقِ تصنیف اور رُجحانات ارتقاء پذیر نظر آتے ہیں۔ بقول سیّد عبداللہ:

باوجود یہ کہ وہ بظاہر اجتہاد پسند اور تقلید سے آزاد معلوم ہوتے ہیں مگر ان کے رجحانات اور مذاق تصنیف کی پیہم تبدیلیاں یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ ان میں بدل جانے اور جلد جلد بدل جانے کی بڑی صلاحیت تھی۔ ان کی تصانیف (مضامین اور اسلوبِ بیان دونوں کے اعتبار سے) ارتقا اور تغیر کا عجیب وغریب نقشہ پیش کرتی ہیں۔(۲۵)

اگرچہ انیسویں صدی کے نصف اوّل میں فارسی زبان و ادب کی روایات اور قدریں انحطاط کے مراحل سے گزر رہی تھیں اور اُردو زبان تیزی سے ارتقائی منازل طے کر رہی تھی۔ اس کے باوجود فارسی زبان و ادب کی علمی و ادبی حیثیت برقرار تھی اور اسے پڑھے لکھے لوگوں کی زبان ہونے کا شرف اب بھی حاصل تھا۔ غالب جیسا جدّت پسند شاعر بھی یہ کہتا ہے:

فارسی بین تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگ من است(۲۶)

غالب کے علاوہ بھی اس دور میں بڑی تعداد ایسے شعرا کی تھی جو اُردو کے ساتھ ساتھ فارسی کے بھی ادیب اور شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ ایسے افراد میں آزردہ، شیفتہ، مومن، رخشاں وغیرہ شامل ہیں۔ اس صدی میں اگرچہ اُردو شاعروں کا آغاز ہو چکا تھا مگر علمی و ادبی معرکوں، اساتذہ کی فارسی تصانیف کی شروح، تذکروں، تقاریظ، خطوط نویسی، لغت نویسی اور اسی نوعیت کی دیگر سرگرمیوں میں اہلِ علم و کمال فارسی دانی کا ثبوت دیتے تھے۔ ''باغ و بہار'' کی سادہ و سلیس نثر کے ساتھ ساتھ ''فسانۂ عجائب'' اور مکاتیبِ غلام غوث بے خبر کی مقفّیٰ و مسجع نثر بھی اس دور میں مقبول تھی۔ ایسے ماحول میں جہاں فارسی زبان اور مقفیٰ و مسجع اور مرصع نثر مقبول عام تھی، سرسیّد احمد خان نے کہیں کہیں مرصع و مقفیٰ عبارتیں لکھی ہیں تو یہ امر باعثِ حیرت نہیں بلکہ یہ اس دور کی عام فضا کا اثر تھا۔ بقول حالی:

اگرچہ فارسی زبان میں جیسا کہ وہ خود بیان کرتے تھے، انھوں نے معمولی کتابوں کے سوا جو مکتبوں میں پڑھائی جاتی تھیں کوئی اعلیٰ درجے کی کتاب نہیں پڑھی تھی، مگر جن مجلسوں اور صحبتوں میں ان کا ابتدائی زمانہ گزرا تھا ان میں دن رات فارسی نظم و نثر کا چرچا رہتا تھا..... اس لیے ضرور تھا کہ فارسی لٹریچر پر ان کی توجہ مائل ہو۔(۲۷)

درحقیقت ''آثارالصنادید'' کے پہلے ایڈیشن کا پُرتکلف اسلوبِ بیان ان صحبتوں اور اس دور کے علمی و ادبی ماحول کا ہی اثر تھا اس لیے اس کو امام بخش صہبائی سے منسوب کرنا درست نہیں۔ امام بخش صہبائی کا طرزِ بیان سب سے الگ اور مفرس و معرب اور مسجع و مقفّیٰ ہے۔(۲۸) صہبائی کی اس مخصوص انداز کی جھلک ''آثارالصنادید'' کے پہلے ایڈیشن میں نہیں پائی جاتی۔

سرسیّد احمد خان نے صہبائی سے دوستی اور رشتۂ اخوت و محبت کو ہمیشہ مضبوط و برقرار رکھا۔ صہبائی کی شہادت کے بعد بھی انھوں نے اس تعلق کو ان کے خاندان کے ساتھ برقرار رکھا، ان کے اہلِ خانہ کی خبر گیری کی، حکومت سے ان کے لیے

وظیفہ مقرر کرایا۔ حالی ''حیاتِ جاوید'' میں لکھتے ہیں:

> مولانا صہبائی کے نواسے محمد حمید الدین کا ایک خط ہمارے سامنے تھانیسر سے سرسیّد کے نام آیا تھا جس میں لکھا تھا کہ مولانا امام بخش صہبائی مرحوم جو اس عاجز کے نانا تھے، ایام غدر میں ان کے بے گناہ قتل ہونے پر عالی حضرت (سرسیّد احمد خان) نے جناب نانی صاحبہ و دیگر درماندگان کا وظیفہ سرکار انگریزی سے مقرر کرادیا تھا۔ جب تک نانی صاحبہ زندہ رہیں بدستور وظیفہ ملتا رہا۔ بندے نے والدین سے سُنا تھا کہ جو احساسات آنجناب کے اس خاندان کے ساتھ ہوئے ہیں وہ بیان سے باہر ہیں۔ (۲۹)

حواشی

(۱) اشتیاق حسین قریشی، برعظیم پاک و ہند کی ملّتِ اسلامیہ (کراچی: شعبۂ تصنیف و تالیف، جامعہ کراچی، ۱۹۸۳ء)، ص ۳۰۷

(۲) الطاف حسین حالی، یادگارِ غالب (نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۹۶ء)، ص ۱

(۳) خلیق احمد نظامی، دلّی تاریخ کے آئینے میں (دہلی: آدم پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز، ۱۹۸۹ء)، ص ۱۳۴

(۴) عتیق صدیقی، غالب اور ابوالکلام (دہلی: مکتبہ شاہراہ، ۱۹۶۹ء)، ص ۱۸۷

(۵) حکیم عبدالحئی، سیّد، گلِ رعنا (اعظم گڑھ: مطبع معارف، ۱۳۵۳ھ)، ص ۳۲۶

(۶) سرسیّد احمد خان، آثار الصنادید، مرتّبہ: ڈاکٹر سیّد معین الحق (کراچی: پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، ۱۹۶۶ء)، ص ۳۳۳

(۷) الطاف حسین حالی، حیاتِ جاوید (لاہور: ہجرہ انٹرنیشنل پبلشرز، ۱۹۸۴ء)، ص ۴۲۵

(۸) ایضاً

(۹) سرسیّد احمد خان، آثار الصنادید، محولہ بالا، ص ۳۳۲

(۱۰) الطاف حسین حالی، حیاتِ جاوید، محولہ بالا، ص ۵۴

(۱۱) ایضاً، ص ۵۵

(۱۲) ایضاً

(۱۳) خلیق انجم، سرسیّد بہ حیثیت مورّخ، مشمولہ: آثار الصنادید، جلد اوّل، مرتّبہ: خلیق انجم (دلّی: اُردو اکادمی، ۱۹۹۰ء)، ص ۱۵۹

(۱۴) جمیل جالبی، تاریخِ ادبِ اُردو، جلد چہارم (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۱۲ء)، ص ۸۳۴

(۱۵) ایضاً

(۱۶) شبلی نعمانی، مقالاتِ شبلی، جلد دوم (اعظم گڑھ: دارالمصنّفین اکیڈمی، ۲۰۰۸ء)، ص ۵۰

(۱۷) الطاف حسین حالی، حیاتِ جاوید، محولہ بالا، ص ۳۹۸
(۱۸) خلیق انجم، سرسیّد بہ حیثیت مورّخ، محولہ بالا، ص ۱۶۶
(۱۹) سرسیّد احمد خان، آثار الصنادید، مرتّبہ: ڈاکٹر سیّد معین الحق، محولہ بالا، ص ۱۴۴
(۲۰) ایضاً، ص ۱۴۵
(۲۱) ایضاً
(۲۲) ایضاً، ص ۱۴۵۔۱۴۶
(۲۳) سرسیّد احمد خان، آثار الصنادید، مرتّبہ: خلیق انجم، محولہ بالا، ص ۲۸۲۔۲۸۳
(۲۴) الطاف حسین حالی، حیاتِ جاوید، محولہ بالا، ص ۳۹۸
(۲۵) سیّد عبداللہ، سرسیّد احمد خان اور ان کے نامور رفقا (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۶ء)، ص ۱۴۔
(۲۶) مضطر مجاز، نقش ہائے رنگ رنگ، غالب کے منتخب فارسی کلام کا منظوم اُردو ترجمہ (حیدرآباد: مکتبہ شعر و حکمت، ۲۰۰۴ء)، ص ۵۶
(۲۷) الطاف حسین حالی، حیاتِ جاوید، محولہ بالا، ص ۴۲۵
(۲۸) جمیل جالبی، تاریخ ادب اُردو، جلد چہارم، محولہ بالا، ص ۸۳۴
(۲۹) الطاف حسین حالی، حیاتِ جاوید، محوّلہ بالا، ص ۵۰۷

مآخذ

(۱) انجم، خلیق، سرسیّد بہ حیثیت مورّخ، مشمولہ آثار الصنادید، جلد اوّل، مرتّبہ: خلیق انجم، دلّی: اُردو اکادمی، ۱۹۹۰ء
(۲) جالبی، جمیل، تاریخ ادب اُردو، جلد چہارم، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۱۲ء
(۳) حالی، الطاف حسین، حیاتِ جاوید، لاہور: ہجرہ انٹرنیشنل پبلشرز، ۱۹۸۴ء
(۴) ـــــــ، یادگارِ غالب، نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۹۶ء
(۵) خان، احمد، سرسیّد، آثار الصنادید، مرتّبہ: ڈاکٹر سیّد معین الحق، کراچی: پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، ۱۹۶۶ء
(۶) صدیقی، عتیق، غالب اور ابوالکلام، دہلی: مکتبہ شاہراہ، ۱۹۶۹ء
(۷) عبدالحئی، حکیم، سیّد، گلِ رعنا، اعظم گڑھ: مطبع معارف، ۱۳۵۳ھ
(۸) عبداللہ، سیّد، سرسیّد احمد خان اور ان کے نامور رفقا، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۶ء
(۹) قریشی، اشتیاق حسن، برعظیم پاک و ہند کی ملّتِ اسلامیہ، کراچی: شعبۂ تصنیف و تالیف، جامعہ کراچی، ۱۹۸۳ء
(۱۰) مجاز، مضطر، نقش ہائے رنگ رنگ، غالب کے منتخب فارسی کلام کا منظوم اُردو ترجمہ، حیدرآباد: مکتبہ شعر و حکمت، ۲۰۰۴ء
(۱۱) نظامی، خلیق احمد، دلّی تاریخ کے آئینے میں، دہلی: آدم پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز، ۱۹۸۹ء
(۱۲) نعمانی، شبلی، مقالاتِ شبلی، جلد دوم، اعظم گڑھ: دارالمصنّفین اکیڈمی، ۲۰۰۸ء